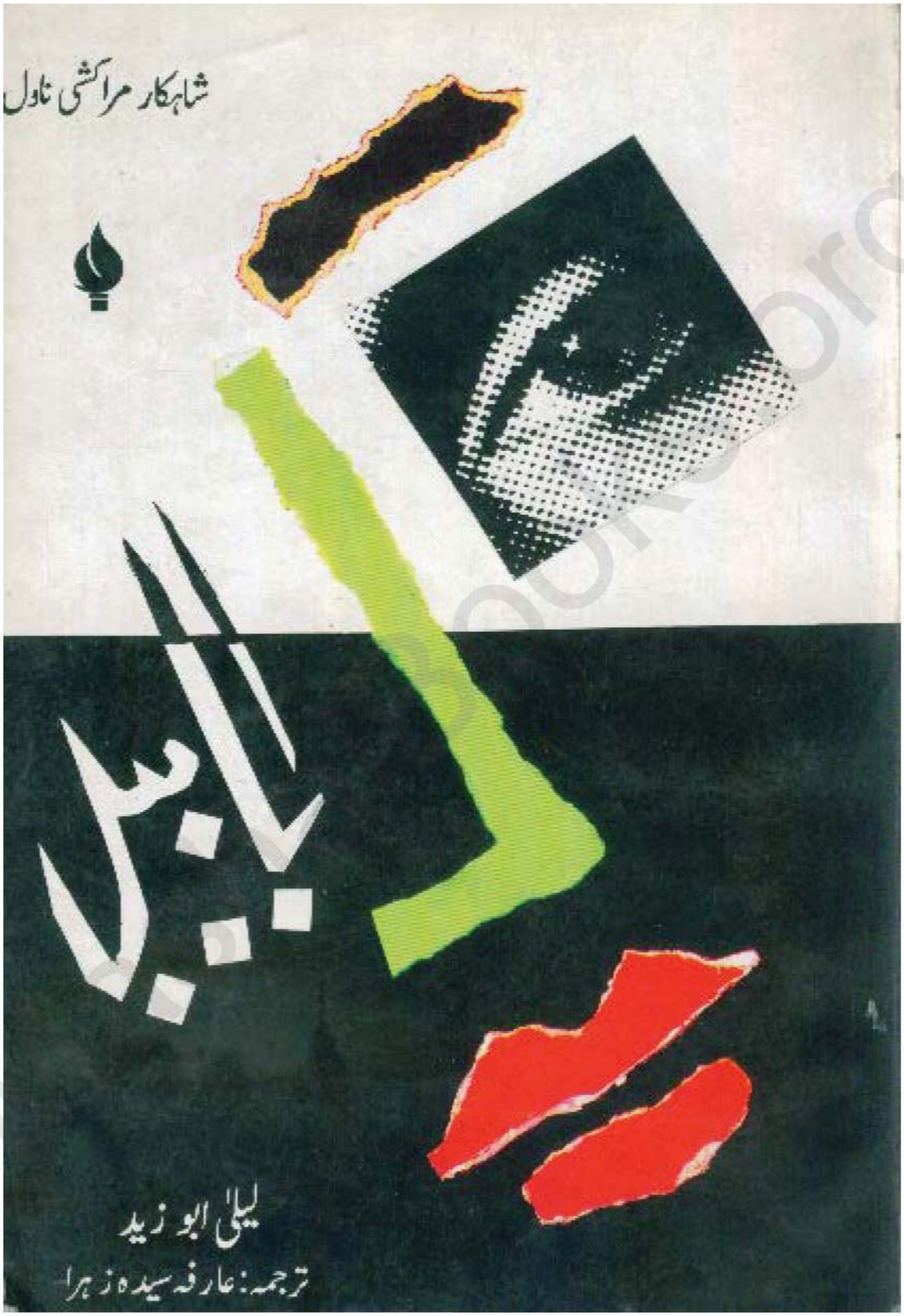
شاہکار مراکشی ناول
لیلیٰ ابو زید
ترجمہ: عارفہ سیدہ زہرا

ابابیل

شاہکار مراکشی ناول

لیلیٰ ابوزید

ترجمہ: عارفہ سیدہ زہرا

MashalBooks.org

مشعل
آر-بی 5 ' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس
عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور 54600 ' پاکستان

تعارف

لیلیٰ ابو زید کا ناول ''ابابیل'' ایک مراکشی خاتون کے سفر کی کہانی ہے۔ مجبوری، بے بسی اور بے یقینی سے خود اعتمادی اور زندگی کو سمجھنے اور قبول کرنے تک کا سفر۔ اس سفر کی یہ کہانی مراکش کی ادبی اور تہذیبی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ یہ پہلا ناول ہے جو کسی مراکشی ادیبہ نے عربی زبان میں لکھا ہے اور پھر انگریزی میں ترجمہ ہوا۔ باربرا پارنٹر نے ترجمہ کی اس ذمہ داری کو خوب نبھایا ہے یہ اولیت تو اس مترجم اور ناول دونوں کو میسر ہے ہی کہ اس سے پہلے کسی مراکشی ادیب کی تحریر انگریزی میں ترجمہ نہیں ہوئی۔

جدید مراکشی ادب کو ابھی حال ہی میں بین الاقوامی توجہ ملی ہے۔۱۹۸۲ء وہ موڑ ہے جب طاہر بن جلون کی ''شب پاکیزہ'' فرانس کے سب سے موثر ادبی انعام ''یعنی ژنکو'' کی مستحق قرار پائی۔ یہ وہ لمحہ ہے جب دنیا مراکشی ادب سے متعارف ہوئی۔ اس کا انگریزی ترجمہ ۱۹۸۹ء میں آیا۔ لیکن ایک بڑا فرق یہاں یہ ہے کہ بن جلون عربی میں نہیں لکھتے، جو شمالی افریقی ادیبوں کا عام قرینہ ہے۔ لن آرٹزن نے ۱۹۷۰ء میں اپنی کتاب ''شمالی افریقی تحریریں'' کے ذریعے پہلی بار بہت سے افریقی ادیبوں کو انگریزی جاننے والی دنیا سے روشناس کرایا۔ اس کتاب میں نو ادیبوں کا ذکر ہے۔ آٹھ مرد، ایک عورت۔ یہ سب ادیب فرانسیسی میں لکھتے رہے ہیں۔ مراکشی ادیبوں میں سے صرف دو، درلیس شریبی اور احمد صفوری شامل ہیں۔ واحد خاتون الجزائر سے ہیں -- آسیہ جبار۔

طاہر بن جلون، آرٹزن کی فہرست میں شامل نہیں ہیں۔ وہ ۱۹۴۴ء میں فیض میں پیدا ہوئے اور پیرس میں رہتے ہیں۔ اس سے پہلے ان کا ناول ''ریگ زادہ'' تیرہ زبانوں میں چھپ چکا ہے۔ شروع کے تبصروں میں اس کا ذکر کچھ یوں کیا گیا ہے'' دیو مالائی، علامتی، شاعرانہ --- یا طنزیہ ---'''' عرب مردوں اور عورتوں کی سماجی حیثیت کی ایک

MashalBooks.org

خوابناک تعبیر'' ---''شب پاکیزہ'' کا مرکزی خیال بھی مراکش کی آزادی کی جدوجہد سے منسلک ہے۔حقیقت اورتمنا کے تانے بانے سے بنی ہوئی خواب اور استعارہ کی کہانی۔جس میں رنج،منافقت اورحرص و ہوس کے سارے رنگ جھلکتے ہیں۔آرٹزن اس سے پہلے جو مراکشی ادب پارے ترجمہ کئے ان کا موضوع بھی آزادی کی جدوجہد ہی تھا۔یہ تحریریں ساٹھ کی دہائی میں لکھی گئیں۔فرانسیسی سامراج کے تسلط سے رہائی،آزادی کی کشمکش کا ردعمل،ایک تشخص کی تلاش اور اقتصادی تحفظ کی تدبیران تحریروں کا مرکزی اور واضح موضوع رہا۔

۱۹۸۰ء میں لکھا جانے والا،لیلیٰ ابوزید کا یہ ناول مرد ادیبوں کے ان ناولوں سے مماثلت بھی رکھتا ہے اور مختلف بھی ہے۔''ابابیل'' بھی مراکش کی جدوجہد آزادی اور اس کے اثرات کی کہانی ہے۔لیکن یہ کہانی اوسط طبقے کی ایک محنت کش خاتون کے زاویہ خیال اور اس کے تجربوں کے تناظر میں لکھی گئی ہے۔بن جلون کی طرح اس تحریر کا بھی عرب معاشرے میں عورتوں اور مردوں کے سماجی کردار سے گہرا تعلق ہے۔لیکن اس کا زاویہ خیال ایک مرد کا نہیں،ایک عورت کا ہے۔اسلوب بے ساختہ ہے۔خواب سے زیادہ حقیقت کی طرح۔لہجہ تلخ نہیں ہے مگر زندگی کے تجربوں کی گونج لئے ہوئے ہے۔

یہ حقیقت کہ لیلیٰ ابوزید فرانسیسی کے بجائے عربی میں لکھتی ہیں اس ناول کی نمایاں خصوصیت ہے۔صاحب کتاب کو تین زبانوں پر یکساں قدرت حاصل ہے،لیکن اپنے اظہار کے لئے انہوں نے عربی کو منتخب کیا ہے۔اس کی وجہ ان کے خیال میں سیاسی بھی ہے اور ذاتی بھی۔عربی میں لکھنے کی اس خواہش اور شعوری کوشش کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے یہ بات اہم ہو جاتی ہے کہ ہم صرف تحریر ہی کو نہیں،صاحب تحریر کو بھی اس تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کریں۔

ابوزید ۱۹۵۰ء میں القصبہ کے ایک اوسط درجے کے گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ یہ وسط اٹلس کا ایک رقبہ ہے جہاں ان کے والد فرانسیسی انتظامیہ کے لئے مترجم کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔۱۹۵۶ء میں جب مراکش کو فرانسیسی سامراج سے آزادی نصیب ہوئی تو لیلیٰ کا سن چھ برس کا تھا۔آزادی کی اس جدوجہد میں لیلیٰ کے والد بھی شریک تھے۔ مراکش کے اعلیٰ طبقے کے قرینے کے برعکس لیلیٰ نے فرانسیسی اسکول کے بجائے مراکشی

اسکول میں تعلیم پائی۔ جہاں فرانسیسی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تدریس میں عربی کو فوقیت حاصل تھی۔ محمد پنجم یونیورسٹی، رباط میں تعلیم پانے کے بعد انہوں نے لندن اسکول آف جرنلزم سے تعلیم حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے پر انہوں نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا اور مراکش کے مقامی رسالوں اور اخباروں میں لکھنا شروع کیا۔ وزارت اطلاعات اور وزیر اعظم کے دفتر میں پریس اسسٹنٹ کے طور پر کام کیا۔ قومی ریڈیو کے ایک بڑے مقبول اور مشہور تقریری پروگرام کی مصنف اور میزبان کے طور پر شہرت حاصل کی۔ مراکشی ٹیلی وژن کے نئے چینل پر میزبان کی حیثیت سے کام کیا۔ اس حیثیت میں کام کرنے سے لیلیٰ کو مراکشی مردوں اور عورتوں کے مسائل کے متعلق آگاہی ہوئی۔ وہ چاہے شہر سے ہوں یا دیہات یا معاشرے کے کسی بھی حصے سے ہوں، لیلیٰ اُن سے واقف ہوئیں۔ لیلیٰ آزاد مراکش کی پروردہ اور نمائندہ ہیں۔ ان کی نسل وہ ہے جس نے ایک نئی اور آزاد حکومت کی سرپرستی میں بلوغت حاصل کی۔ انہیں جو معاشرہ ملا، وہ اس معاشرے سے بالکل مختلف تھا، جس کا تجربہ ان کے والدین کو ہوا تھا۔ ''ابابیل'' تین مسائل سے بحث کرتا ہے اور یہ تینوں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ تاریخ کا مسئلہ، قومی زبان کا مسئلہ اور عورتوں کی حیثیت کا مسئلہ۔

الجزائر کے خونی انقلاب نے مغربی مبصرین کے لئے مراکش کی قومی تحریک آزادی اور دنیائے اسلام پر اس کے دیرپا اثر کو دھندلا دیا۔ لیکن مشرق وسطیٰ کی قومی تحریکوں میں مراکش کی جدوجہد آزادی نے ایک بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ سامراجیت کے خلاف مراکشی مزاحمت کے تجربے نے مراکش کو ایک مثالی حیثیت عطا کی ہے۔ مراکش کبھی اس خلافت عثمانیہ کا حصہ نہیں رہا جس کا دائرہ اختیار مشرقی یورپ سے لے کر عرب اور شمالی افریقہ کی مملکتوں تک محیط تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ان تمام ممالک تک جو آج مشرق وسطیٰ کے نام سے موسوم ہیں۔ مراکش کی تاریخ اپنی نوعیت میں بے نظیر ہے۔ اس معاملے میں مغربی اور مشرقی ماہرین متفق ہیں۔ ان کے خیال میں ابھی ماضی قریب تک مراکش کا علاقہ ایک دوسرے منسلک مگر اپنے طور پر مختلف حصوں پر مشتمل تھا۔ شہروں میں مرکزی حکومت کی ایک صورت ''بلد المخزن'' کی شکل میں موجود تھی۔ لیکن اندرونی علاقوں میں قبیلوں نے اپنے اپنے قانون وضع کئے تھے اور اسے ''بلد السبا'' کا نام دیا تھا۔ یعنی کہ اختلاف کرنے والوں کے علاقے۔ یہ قبیلے حاکم وقت کو سالانہ خراج بیعہ ادا کرتے

MashalBooks.org

تھے۔ یہ آپس کے قبائلی اختلافات کو کم کرنے کی ایک علامت تھی۔لیکن ان کی عمومی زندگی ہر لحاظ سے خودمختار تھی۔ سترھویں صدی میں پرتگالی اور برطانوی تاجر مراکش کے اٹلانٹک ساحل پر بس گئے تھے۔ یہاں بحری قزاق بھی عام تھے۔لیکن مراکش کے مخزن اور سبا کے اندرونی غیر متناسب اقتدار کر اس صورت حال سے کوئی خاص خطرہ نہ تھا۔انیسویں صدی میں ہسپانوی اور پھر فرانسیسی حملوں نے اس صورت حال کو متاثر کیا۔

لیلیٰ ابوزید کے ناول کی روح کو سمجھنے کے لئے مراکشی تحریک آزادی کا پس منظر جاننا ضروری ہے۔مورخ مغربی سامراج کی ابتداء ۱۷۹۸ء کے شروع سے متعین کرتے ہیں جب نپولین نے مصر پر حملہ کیا۔الجزائر میں فرانسیسی عمل دخل ۱۸۳۰ء سے شروع ہوا۔مراکش کو فتح کرنے میں کہیں زیادہ وقت لگا۔انیسویں صدی کے وسط تک مراکش کا سلطان شریف الجزائر کے امیر عبدالقادر کو اسلحہ اور سامان کی کمک بھیج رہا تھا تاکہ وہ فرانس کے خلاف مزاحمت جاری رکھ سکیں۔گو فرانسیسی ایک بڑی تعداد میں الجزائر میں رس بس گئے تھے انہوں نے اپنا قبضہ جما لیا تھا اور الجزائر کی زمین پر کاشت شروع کر دی تھی۔ مراکش کی مزاحمت کا چیلنج فرانسیسیوں کے لئے معمولی بات نہ تھی۔انہوں نے مراکش پر ایک بھرپور حملہ کیا اور پہلی اگست ۱۸۴۴ء کو مراکشی فوج کو امیلی کے مقام پر پسپا کر دیا۔اس کے بعد سلطان نے الجزائر کی مدد سے ہاتھ اٹھا لیا۔۱۸۶۰ء میں اسپین نے مراکش کے بحیرہ روم کے شمالی ساحل پر ایک اہم شہر طیطوان پر قبضہ کر لیا۔اس وقت تک مراکش کی لڑائی فرانس اور اسپین دونوں کے خلاف جاری تھی۔ایک مدت بعد فرانس نے بہت سے باغی قبیلوں کو رام کر لیا اور دوسرے قبیلوں کو خوش رکھنے کے لئے بہت سی مصالحتی کوششیں کیں تاکہ ان کی حمایت حاصل ہو سکے۔اسپین کے اشتراک سے ایک حفاظتی حکومت قائم کی جو چوالیس سال تک برقرار رہی۔

۳۰ مارچ ۱۹۱۲ء کو حفاظتی حکومت کے قیام کے اعلانیہ پر دستخط ہو جانے کے باوجود مراکشی مزاحمت ختم نہیں ہوئی۔دراصل یہ کبھی ختم بھی نہیں ہوئی۔دس سال بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ ریف کی مشہور بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی۔ایک بے حد امیر زمیندار محمد عبدالکریم خطابی اس کا لیڈر تھا۔جسے یہ بات کسی طرح گوارہ نہ تھی کہ فرنگی اس کی املاک کو اپنے تصرف میں کر لیں۔پہلے اس نے ہسپانوی حکمرانوں کی حکم عدولی شروع کی اور پھر

۱۹۲۱ء میں فرانسیسیوں کو بھی در خور اعتنا نہ جانا۔ اس طرح وہ ریف کے علاقے کے قبیلوں کے ایک بڑے اتحاد کا سربراہ بن گیا۔ یہ علاقہ مراکش کے شمالی پہاڑی علاقہ پر مشتمل تھا وہ اس علاقے میں اگلے پانچ سال تک اسپین اور فرانس دونوں سے چومکھی لڑتا رہا۔ ریف کی اس بغاوت کو اس وقت تو امریکہ اور یورپ نے توجہ کے لائق نہ جانا لیکن مسلم دنیا کی توجہ نے اس کو جذب کیا۔ وجہ یہ تھی مسلم اقوام خود ۱۹۱۹ء میں ورسائے معاہدہ پر دستخط کرنے کے بعد سے یورپی طاقتوں کے خلاف احتجاج کر رہی تھیں۔ ورسائے معاہدہ سے عرب دنیا کی بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ برطانیہ اور فرانس نے ان سے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ اگر وہ جرمنی کی مخالفت میں مدد کرتے رہے تو انہیں خود مختاری مل جائے گی۔ لیکن معاہدے کی شقوں سے ہی یہ سارے وعدے کالعدم ہو گئے۔ برطانیہ، فرانس اور اسپین نے خلافت عثمانیہ کو واقعتاً اپنے درمیان تقسیم کر لیا تھا۔ انہوں نے حفاظت کے حیلے بہانے مشرق وسطیٰ میں اپنا قبضہ واختیار قائم کر لیا تھا۔ ان ملکوں کے ہر احتجاج کو پس پشت ڈال دیا جن سے آزادی کا وعدہ کیا گیا تھا۔ مراکش بھی ان ہی میں شامل تھا۔

ریف کی بغاوت جاری رہنے سے یورپی سامراج کے خلاف موثر مزاحمت کو جاری رکھنے کی امیدیں بڑھ گئی تھیں۔ آزادی کی خاطر مزاحمت میں شریک ہونے والوں کے لئے چندوں سے رقم جمع کی گئی۔ یہاں تک کے ہندوستان بھی ان مدد کرنے والوں میں شامل تھا۔ اس مہم کی کامیابی تیونس کی تحریک آزادی کے لئے ایک مثبت علامت بن گئی۔ انہوں نے بھی اسی طرح امداد جمع کرنا شروع کی۔ بقول سی آر پینل ''شہر میں رہنے والوں کے لئے ایک نئی دیومالا ابھری، جس کا محور ریف کا سردار تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ دو چھوٹے اور معمولی قبائلی فوجی دستوں نے یورپ کی دو بڑی مملکتوں کی فوج کو پسپا کر دیا تھا۔ یہ بات روایت اور وراثت کے طور پر ہی سہی، لوگوں کے ذہنوں میں تازہ تھی۔ بعد میں یہی تمام مزاحمت کی بنیاد بنی۔ عبدالکریم وہ نام ہوا جو ۱۹۵۰ء کے واقعات میں بار بار دہرایا گیا۔ یہی واقعات ''ابابیل'' کی ڈرامائیت میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ صرف اسپین کا تخمینہ یہ تھا کہ بغاوت کے شروع کے سالوں میں دس ہزار جانیں ضائع ہوئیں اور ایک پوری فوج تو سرے سے ہی ختم ہوگئی۔

۱۹۲۶ء میں آخر کار، عبدالکریم کے بیٹے نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اسے فرانسیسی

کالونی ری یونین میں جلاوطن کیا گیا۔تاہم ریف کی بغاوت کے اثرات باقی رہے۔ ۱۹۴۶ء میں وہ ری یونین سے بچ نکلا اور قاہرہ میں جا کر رہنے لگا۔۱۹۶۳ء میں وفات تک وہیں رہا۔وہ نارتھ افریقن ڈیفنس لیگ کا لیڈر تھا جو نارتھ ویسٹ افریقن نیشنلسٹ کی ذیلی تنظیم تھی۔

ناول کی مصنفہ کی توجہ مراکش کی جدوجہد آزادی کے آخری مرحلے کے واقعات پر ہے۔جس کے متعلق دانشوروں کا خیال ہے کہ اس کی ابتدا ۲۲ جنوری ۱۹۴۳ء کو ہوئی۔ یہ وہ دن تھے جب کیسابلانکا میں امریکی صدر فرینکلن روزولٹ اور سلطان سیدی محمد یوسف کے درمیان ملاقات ہوئی۔امریکہ کی طرز سیاست اس عہد کے لئے ایک مثال بن گئی۔امریکی بل آف رائٹس کی خصوصیات قومی تحریکوں کی تحریروں میں حق خوداختیاری کی گونج بن کر ابھریں۔

لیلیٰ ابوزید کے اس ناول کا انتساب یوں ہے’’میں یہ کتاب ان مردوں اور عورتوں کے نام منسوب کرتی ہوں جنھوں نے مراکش کی آزادی کی خاطر اپنی جانیں خطرے میں ڈالیں لیکن اس کی توقع نہیں رکھی کہ انہیں اس کا انعام ملے یا ان کا شکریہ ادا کیا جائے۔‘‘لیلیٰ کا خیال ہے کہ مراکش کی اکثریت اس جدوجہد میں شریک تھی۔ یہاں تک کہ بذات خود سلطان بھی جو بعد میں سلطان محمد پنجم کے نام سے آزاد مراکش کے پہلے اور ہردلعزیز حکمران بنے۔حاکم ہونے کا یہ تجربہ بھی مشرق وسطیٰ کے دوسرے ملکوں سے مختلف ہے۔ مثال کے طور پر مصر کے شاہی خاندان کی تحریک آزادی میں شمولیت، درحقیقت برطانوی حکومت کی ساز باز پر مبنی تھی۔۱۹۵۲ء میں جمال ناصر اور محمد نجیب کی قیادت میں افسروں کی بغاوت ہوئی اور شاہ فاروق کو معزول کر کے جلاوطن کیا گیا۔اس کے برعکس مراکش کا سلطان سب سے اہم قومی پارٹی استقلال کا معاون و ممد تھا۔اس جرم وفا پر فرانسیسیوں نے اسے جلاوطن کیا۔وفا رنگ لائی اور وہ مراکش کا قومی ہیرو بن گیا۔لیلیٰ ابوزید کی زہرانے سلطان کی جلاوطنی کا اثر جس پیرائے میں بیان کیا ہے وہ افسانوی سے زیادہ سچا اور لوگوں کے جذبات کا صحیح عکاس ہے۔سلطان کی ہردلعزیزی بڑھتی گئی اور مراکش کے عوام، دوری کے باوجود، جذباتی طور پر سلطان کے قریب ہوتے گئے۔اس کی شخصیت پر تقدیس کا رنگ چڑھتا گیا۔یہ ایک ایسا تعلق ہے جو انسان کے پیکر سے زیادہ

کیس اصول یا آئیڈیل سے ہوسکتا ہے۔مراکشی عوام کے لئے سلطان کی جلاوطنی نے فرانس کے خلاف غصہ اورنفرت کے لئے جلتی پرتیل کا کام کیا۔

یہ ناول تاریخی ناول نہیں ہے۔نہ تاریخ اس پر مسلط ہے۔لیکن پورے ناول میں واقعات کی نوعیت میں تاریخ جھلکتی ہے۔ناول کا بیانیہ، روزمرہ کے اس معمول سے منسلک ہے جو ناول کے مرکزی کردار زہرا کی زندگی ہیں۔اس کا بچپن، شادی، آزادی کی وہ تحریکیں جن میں وہ شامل رہیں، اس جدوجہد کی فتح، نئی حکومت کا قیام، اس نئی حکومت میں اس کے شوہر کا اہم عہدہ، اس کی طلاق، زندگی سے بلاواسطہ سامنا اور پھران سارے تجربوں کی میزان پر پرکھا ہوااس کا تجزیہ کہ آزادی اصل میں ہوتی کیا ہے؟

مورخین اور ماہرین سیاست کے خیال میں۱۹۵۲ء ہونے والا کیسابلانکا کا قتل عام اس پوری جدوجہد کی مزاحمت کا اہم موڑ ہے۔۱۳دسمبر۱۹۵۲ء کے نیویارک ٹائمز نے فرانسیسی پولیس کی بہیمیت کا ذکر کیا جس میں سینکڑوں نہتے اور بے گناہ شہری مارے گئے۔اس واقعہ کے بعد سے عام مراکشی شہری بھی حریت پسندوں کی مدد کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔لیلیٰ ابوزید کی ہیروئن بھی ان ہی میں سے ایک تھی۔

مصنفہ نے مراکشی جدوجہد کے لئے تاریخ سے جو استعارہ تلاش کیا وہ ''ابابیل'' کا ہے۔قرآن مجید میں اس کا ذکر ہے۔اس لئے استعارے کی معنویت بڑھ جاتی ہے۔چھٹی صدی عیسوی کا یہ واقعہ معاشی اورسیاسی اغراض کے مضمرات پرمبنی ہے۔ جب ابرہہ نے مکہ پر چڑھائی کی وہ اپنی فوج اور ہاتھیوں پر ناز کرتا آگے بڑھا۔اس کا خیال تھا اگر اہل مکہ مقابلہ نہ کریں گے تو ان سے تو کچھ غرض نہ رکھے گا لیکن کعبہ کو ڈھادے گا۔لیکن ہاتھیوں کی ہیبت نا کی، اور فوج کا طنطنہ چھوٹے چھوٹے پرندوں کے جھنڈ نے کنکریاں مار مار کر خاک میں ملادیا۔جس سال یہ واقعہ پیش آیا، اہل عرب اسے ہاتھیوں کا سال کہتے ہیں اوراسی سال رسول کریمؐ کی ولادت بھی ہوئی۔یہ جنگ نہ تعداد سے جیتی گئی نہ اسلحے سے۔بہت ہی معمولی اور بے نام فاتح تھے اس جنگ کے۔ان کا سامان حرب بھی انتہائی کم وقعت تھا۔پرندوں کے غول اوران کی چونچ میں کنکریاں۔دیوہیکل جانوراور مسلح فوجی ان کا حملہ نہ سہار پائے اور پسپا وخوار ہوئے۔

اس استعارہ سے لیلیٰ ابوزید مراکش کی جنگ آزادی کی فتح کا کارنامہ بھی

عام، معمولی، بے وقعت اور بے دست و پا شہریوں سے منسوب کرتی ہیں۔ زہرا اسی معمولی، کم وقعت اور بے نام غول میں سے ایک ہے لیکن اس جیسے لوگوں کی بدولت ہی فرانس کے خلاف مزاحمت کامیاب وسرخرو ہوئی۔ لوہار، خانہ دار عورتیں پنساری، قالین فروش، لاری ڈرائیور، جیسے لوگ تھے جو اپنی جان جوکھم میں ڈال کے آزادی کے لئے اپنے اپنے محاذ پر لڑ رہے تھے۔ ان جیسے لوگ کتابوں میں ''مظاہرین'' یا احتجاج کرنے والا'' کہلا کر بے نام ونشان رہ جاتے ہیں۔ اس ناول میں مصنفہ نے انہیں چہرہ اور نام دیا ہے۔ وہ چاہے پنساری ہو جس کے ہاتھ پر رسولی کی طرح چھٹی انگلی ہے۔ یا وہ ہنس مکھ لوہار، جو امید کی لو بجھنے نہیں دیتا، یا وہ خاتون جو اپنے گھر کا گودام پناہ گاہ بنا لیتی ہے، یا ویت نام کی جنگ کا زخم خوردہ لنگڑا سپاہی۔ سب اپنی اپنی جگہ ہاتھیوں پر کنکریوں سے حملہ کرتے ہیں اور فتح پاتے ہیں۔

اپنے کردار کے ردعمل سے مصنفہ اپنے پڑھنے والوں کو اس تجربے کا حصہ بنا لیتی ہے۔ ۲ مارچ ۱۹۵۶ء کو مراکش کی آزادی کا اعلان ہوا۔ لیلیٰ ابوزید اس دستاویز کی سرکاری تفصیل کی گریز کرتی ہیں۔ ناول میں پوری توجہ بادشاہ کی فاتحانہ واپسی پر مرکوز ہے اور لوگوں کی خوشی کے اس شدید ردعمل کا موثر اظہار ہے جو برسوں کے غم وغصہ اور محرومی کے بعد نصیب ہو پائی۔ اپنے حاکم کی اپنی زبان میں تقریر کی آزاد سرزمین میں گونج لوگوں کے دلوں میں برسوں زندہ رہی۔ تاریخ لوگوں کی جذباتی زندگی پر کتنے ان مٹ نشان چھوڑ سکتی ہے، لیلیٰ ابوزید کھلے دل سے اس کا اعتراف کرتی ہے۔

قومی تشخص میں زبان کی حیثیت کلیدی ہے۔ غلامی میں زبان اختیار کا ایک بڑا وسیلہ بنتی ہے۔ مراکش کی چالیس سال کی محکومی فرانسیسی زبان کی برتری کا عرصہ ہے۔ وہ فاتحوں کی زبان تھی، سرکار کی زبان تھی، تجارت اور تعلیم کا ذریعہ تھی۔ مکمل اختیار کا ایک ذریعہ اظہار۔ عربی صرف مذہبی معاملات تک محدود تھی۔ جہاں کلاسیکی زبان استعمال ہوتی تھی، یا اس چھوٹے سے حلقے میں جہاں عربی کا مغربی لہجہ روزمرہ تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر، مراکش میں جتنا بھی جدید ادب لکھا گیا وہ سب فرانسیسی میں لکھا گیا، عربی میں نہیں۔ مردوں نے لکھا عورتوں نے نہیں۔ ایک وجہ تو یہ تھی معدودے چند فرانسیسی اسکولوں میں تعلیم پانے والوں میں مردوں کی تعداد عورتوں سے کئی گنا زیادہ تھی۔ تسلط کی یہ نفسیاتی

MashalBooks.org

شکل محکوم معاشروں کی ذہنیت میں عام ہوتی ہے۔

زبان کا مسئلہ اور اس کا قوت واقتدار سے انتہائی نازک رشتہ فرانسیسی تسلط کے دنوں میں بھی اہم تھا۔فرانسیسیوں نے اپنے اور چند گنے چنے مقامی لوگوں کے بچوں کے لئے فرانسیسی اسکول قائم کئے اسی کے متوازی مراکشی عمائدین نے وہ اسکول قائم کئے جہاں عربی کی تعلیم دی جاتی تھی۔اس طرح عربی زبان مزاحمت کی ایک علامت بن گئی۔قومی حکومت کے ابتدائی سالوں میں زبان کا مسئلہ بہت اہم رہا۔مراکش کے مستقبل کے فیصلوں میں تعلیمی نظام کو عربی سے منسلک کرنا اولین مقصد بن کر ابھرا۔اس پر عمل درآمد کرنا اتنا آسان نہ تھا۔اس لئے جیسا کہ بہت سے مبصرین نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ وہ چند ہزار بچے جو مراکشی اسکولوں میں زیر تعلیم تھے انہیں عربی زبان کے لئے مہلت کم ملتی تھی۔ان کا زیادہ تر وقت فرانسیسی زبان اور دوسرے بنیادی اور اہم مضامین کی تدریس میں صرف ہوتا تھا۔آزاد مراکش کی ایک ایسی قوم کا سامنا تھا جس کی اکثریت جاہل اور غیر تربیت یافتہ تھی۔فرانسیسی حکومت کے بلند بانگ دعوے ایک طرف،حقیقت یہ تھی کہ ۱۹۵۰ء میں آزادی کے موقع پر صرف چالیس مرد یونیورسٹی گریجویٹ تھے اور صرف چھ لڑکیوں نے ہائی اسکول پاس کی۔اب ان چند ہزار بچوں کی استعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، جو اسکولوں میں بظاہر پڑھتے تھے۔

ماہرین تعلیم کو،آزاد مراکش میں دیوہیکل دشواریوں کا سامنا تھا۔استقلال پارٹی نے ہر خواہشمند شہری کے لئے مفت تعلیم کا وعدہ کیا تھا۔اس پالیسی کو بھی واضح کر دیا تھا کہ سرکاری اور تدریسی زبان عربی ہوگی۔عربی کو وسیلہ تعلیم بنانے کا ارادہ اس لئے اولیت رکھتا تھا کہ یہ زبان عرب مسلم شناخت اور قومی تعمیر نو کی بنیاد بن سکے گی۔

عربی زبان کا عرب مسلم شناخت کی علامت بن جانا،تصوراتی حد تک انتہائی معقول اقدام معلوم ہوتا تھا۔لیکن عملی دشواریوں کے پیش نظر اس تجویز کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔مراکش کے بیشتر اساتذہ، چند مذہبی عالموں اور قرآنی مدرسوں کے سوا،سب فرانسیسی میں تربیت یافتہ تھے۔عربی میں تربیت یافتہ فوری طور پر تدریس کے لئے کہاں سے لائے جائیں؟ فرانسیسیوں نے بہت کم اسکول بنائے تھے۔ ہر بچے کو تعلیم دینے کے لئے نئے اسکول بنائے بغیر اتنی کثیر تعداد کو کیسے پڑھایا جائے؟ محکومی میں نصاب تعلیم اور

MashalBooks.org

امتحانوں کا نظام فرانسیسی طرز کا تھا۔ نیا نصاب تعلیم بنانے میں کتنا وقت لگے گا؟ اس نصاب تعلیم کی تشکیل کون لوگ کریں گے؟ نئی حکومت کے اکثر عہدیدار یا تو فرانس میں تربیت حاصل کر کے آئے تھے یا فرانسیسی اسکولوں میں ان کی تعلیم ہوئی تھی۔عربی میں ان کی مہارت انتہائی ناکافی تھی۔ایک سمجھوتے کی راہ نکالی گئی۔مراکش اپنے حالات کے پیش نظر دوزبانوں پر انحصار کرے گا۔عربی کی ترویج اور ذریعہ تعلیم میں تبدیلی لانے کے لئے ایک وقت چاہئے تھا،اس لئے عبوری طور پر کوئی اور حل تلاش کرنا پڑے گا۔عربی پر مکمل انحصار کے مدارج آہستہ آہستہ ہی طے پائیں گے۔

اس وقت جب زبان کے مسئلہ پر یہ بحث چل رہی تھی لیلیٰ ابوزید اسکول میں تھی۔انہوں نے عربی اور فرانسیسی دونوں زبانوں میں تعلیم حاصل کی۔لیکن اپنی تحریر کے لئے عربی کا انتخاب کی۔صرف اس لئے نہیں کہ یہ زبان ان کے دین اوران کے وطن کی زبان ہے بلکہ اس لئے کہ ان کے پڑھنے والے زیادہ تر مسلم عرب دنیا میں رہتے ہیں۔جہاں فرانسیسی یا انگریزی نہیں صرف عربی اکثریت کی زبان ہے۔وہ اپنا دائرہ محدود نہیں کرنا چاہتیں،عوام تک پہنچنا چاہتی ہیں۔وہ صرف ناول،افسانے اور تبصرے ہی عربی میں نہیں لکھتیں،اپنا ریڈیو پروگرام بھی عربی میں کرتی ہیں۔وہ مراکش میں ریڈیو پر کلاسیکی عربی شاعری کی ڈرامائی پیشکش اور مراکشی فلموں کے منظر نامے عربی میں لکھنے کے لئے مشہور ہیں۔وہ میلکم ایکس کی سوانح حیات بھی عربی میں لکھ رہی ہیں۔

زبان کا مسئلہ،مراکشی معاشرے میں عورت کے مقام اور کردار سے بھی منسلک ہے۔قرون وسطیٰ میں عورتوں کو کلاسیکی عربی کی تعلیم دی گئی۔بیسویں صدی تک کلاسیکی عربی،مذہب،قانون اور مردوں کی عملداری میں تھی۔عربی زبان مختلف لہجوں اور بولیوں کی نمائندہ ہے۔ایک زبان مختلف حوالوں سے مختلف لہجوں اور بولیوں میں استعمال ہوتی ہے۔علم اور مذہب کے حوالے سے کلاسیکی عربی استعمال ہوتی ہے۔ ہر گھر کی چاردیواری میں غیر رسمی روزمرہ کی زبان بولی جاتی ہے۔سامراجیت کے خاتمے اور ہرسطح پر عربی زبان کی تعلیم ترویج سے یہ تبدیلی آنا شروع ہوتی کہ جدید معیاری عربی پوری عرب دنیا میں ابلاغ کی مسلمہ زبان ہے۔زمانہ وسطیٰ کے یورپ میں بھی ایسی ہی تقسیم موجود تھی۔وہاں لاطینی علم وتہذیب کی زبان،مذہبی عالموں اوراعلیٰ سطح کے کچھ پڑھے لکھوں کی زبان تھی اور

یہ سب مرد تھے۔ جس دن سے روزمرہ نے معیاری ہونے کی سند پائی تب سے جدید ادب کا ارتقاء شروع ہوا۔ یہ بات ہماری سمجھ میں اب آتی ہے کہ یورپ میں بھی اسی وقت سے عورتوں اور مردوں کی اکثریت نے لکھنا اور شائع ہونا شروع کیا۔

لیلیٰ کے قصوں کی زبان وہ عربی ہے جو آج مستند جدید عربی سمجھی جاتی ہے۔ ان کے مکالمے روزمرہ، مگر انتہائی مہذب لہجے میں ہوتے ہیں۔ ''ابابیل'' میں استعمال ہونے والی عربی بھی اپنی جگہ ایک اہم اور انوکھی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لئے انہیں ایک نئے اسلوب کا موجد کہا جاتا ہے کہ ان کا کام نئی اور پرانی دنیا کو زبان کی شطرنجی پر روبرو کر دینا ہے۔ ان کے تبصرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ زبان کی ساخت اور پرداخت کے حوالے سے، لیلیٰ جدید عرب شاعروں اور قصہ نگاروں کی صف میں شامل ہیں۔ ان کے جملے مختصر اور بڑے تہہ دار ہوتے ہیں۔ اسی لئے توجیہہ اور تشریح کے لامحدود امکانات پیدا کرتے ہیں۔ اس ساری جدت جن کے باوجود وہ کلاسیکی کی عربی کا لطف اور قرینہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں۔ ۱۹۸۳ء میں اس ناول کے کتابی شکل میں چھپنے سے پہلے ہی یہ ہزاروں پڑھنے والوں کی دلچسپی کا مرکز بن چکا تھا۔ رباط کے ایک اخبار ''المیثاق الوطنی'' میں اس کی قسطیں سلسلے وار چھپتی رہیں۔ ان قسطوں کو پڑھنے کے بعد البقائی نے لکھا تھا ''پہلی ہی سطر سے یہ محسوس ہوتا ہے جیسے لیلیٰ اور ہم پرانے دوست ہوں۔ وہ ہمارا ہاتھ تھامے ایک کہانی سنا رہی ہوں۔ ان کا اسلوب سادہ، دلکش اور پرلطف ہے۔ یہ ایسا اسلوب ہے جو لہجہ کی نرمی اور احساس کی شدت سے تشکیل پاتا ہے۔ یہ احساس ایک تعلیم یافتہ اور باریک بیں خاتون کا احساس ہے۔'' کتاب ہاتھوں ہاتھ بک گئی اور دوبارہ چھپی۔ کلاسیکی عربی کی گونج، نئی اور پرانی زبان کی گنگ جمنی کیفیت، ترجمہ پڑھنے والوں پر تو نہ کھل سکے، لیکن مناظر، بیان، زمین اور فرد کا رشتہ، روزمرہ زندگی کے واضح اور دیانتدار عکس بالکل شفاف طور پر سامنے آتے ہیں۔ یہ وہ اجزاء ہیں جو کلاسیکی عربی ادب کے مزاج کا حصہ ہیں۔

اس طرح ''ابابیل'' ایک نئی طرز کا ناول ہے۔ آزاد مراکش کی ایک عورت کو اپنی آواز اور زبان ملتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ صرف ایک نسائی کوشش ہے؟ ہم اس اصطلاح سے مراد کیا لیتے ہیں؟ مغرب میں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق مل جائیں۔ اس کا تعلق انفرادیت کی توثیق سے بھی ہے کہ کیا جسمانی

تفریق کو افراد کی معاشرتی حیثیت کے تعین کی میزان مقرر کر دیا جائے؟ ایک فرانسیسی سوشیالوجسٹ، جولیٹ منزا الجزائر کے متعلق لکھتی ہیں ''عرب دنیا میں عورتوں کی حیثیت کو کیا اسی میزان پر پرکھا جا سکتا ہے جو مغرب کی میزان ہے؟ کیا یہ یورپ کی خود پسندی نہیں ہے کہ صرف مغرب کی عورت کی زندگی کو جمہوری، انصاف پسند اور مستقبل پرست کے طور پر نمونہ بنا کر پیش کیا جائے؟ میں ایسا نہیں سوچتی۔ مغرب کی عورت کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ عورتوں کو بھی ''لوگوں'' کی طرح آزاد کرایا جا سکے''

یقیناً بہت سے لوگ، اپنے اپنے تہذیبی اور مذہبی پس منظر کے باوجود، آزادی کی چند بنیادی ضرورتوں پر متفق ہو جائیں گے۔ مساوی حقوق تک قانونی دسترس جیسے صحت اور دولت تک رسائی کے یکساں موقع، جبر و استبداد سے تحفظ جیسے قید، غلامی اور جسمانی تشدد کا ہدف نہ بننا۔ ان عمومی حدوں کے اندر بھی ہر تہذیب کی ہر عورت کو اپنے لئے انتخاب کا حق حاصل ہے۔ اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی اور دوسری تہذیبی روایتوں کے اشتراک اور انتخاب سے اپنے لئے زندگی کا پروگرام بنا سکے۔ یہ اس کا نسائی تجربہ ہوگا۔ اس تجربے کی حتمی شکل، تصور اور اہمیتوں کے لحاظ سے مختلف ہو سکتی ہے، عمل کی رفتار میں بھی فرق ہو سکتا ہے۔ لیکن انصاف کی طلب کے مقاصد میں کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ ''ابابیل'' عورت کی زندگی کے ان تمام مسائل کا سامنا کرتا ہے اور ان سے نبٹتا ہے۔ ناول کا آغاز زہرا کی طلاق سے ہوتا ہے۔ وہ اس احساس سے بے خبر نہیں ہے کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ زہرا کے سامنے ایک تاریک مستقبل ہے۔ اس کا شوہر، اس کی زندگی کا واحد وسیلہ اسے رد کر چکا ہے۔ مذہب کے جو قوانین اس کی زندگی کے لئے حکم رہے ہیں اس مرحلے پر اس کے لئے کافی ثابت نہیں ہوتے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بدلتی دنیا کے تقاضوں کی خاطر عائلی قوانین اصلاح چاہتے ہیں۔ مراکش میں آزادی کے بعد سے اس ضرورت پر زور دیا جاتا رہا ہے۔

یوں بے سہارا ہو کر زہرا کیا کرے؟ کس کی طرف پلٹے؟ ایک ایسے معاشرے میں جہاں والدین اولاد کی ہر مشکل میں ان کے ساتھی ہوتے ہیں، چاہے انہیں طلاق حق جائے، بیوہ ہو جائیں یا مالی پریشانیوں سے چور ہوں، وہی آڑے آتے ہیں۔ اس کے تو وہ بھی نہیں رہے۔ اپنے وطن پلٹی ہے تو ایک چھوٹا سا کمرہ اس کی ساری کائنات ہے۔

اس کے والدین کے ترکہ میں اس کا حصہ۔ اس کا مزار کے عالم کے پاس جان نسائیت کے ایک مغربی علم بردار کے لئے بڑی حیران کن بات ہے۔ ایسی آفت زدہ عورتوں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ مذہبی عالموں کے پاس غموں کا مداوا کرنے جائیں گی۔ طلاق تو اسے مل گئی مگر اس لئے نہیں کہ اس کا جرم آزادہ روی، مشکل پسندی تھا، وہ تو اس لئے مسترد کی گئی کہ اپنی تہذیب کی پروردہ، روایتی عورت تھی۔ وہ کانٹے سے کھانا نہیں کھاتی، فرانسیسی نہیں بولتی، مردوں سے گھلتی ملتی نہیں اور بڑی بڑی دعوتوں میں شریک نہیں ہوتی۔

تہذیبی تفریق کے باوجود، زہرا کا نصیب وہی ہے جو ایک طلاق یافتہ، جاہل اور معاشی طور پر مجبور عورت کا ہوتا ہے۔ اپنی زندگی گزارنے کے لئے اسے کام کرنا چاہئے۔ سر چھپانے کو آسرا چاہئے اور زندہ رہنے کو ایک وجہ چاہئے۔ یہ کان نہ تو سہل ہے اور نہ خوشگوار، زہرا کی زندگی جس انداز کی گزری، اس کی کئی شکلیں ہیں۔ قصبہ کی لڑکی، گوریلا مجاہد، ایک خانہ دار عورت---کسی شکل میں بھی تو اسے وہ مہارت اور تجربہ نہ مل سکا جو زندگی کے بازار میں بھنایا جاسکے۔

اس کا بہنوئی اس کا ان پڑھ ہونا اس پر واضح کرتا ہے۔ وہ اسے اپنے گھر میں رکھنے کو تیار ہے۔ لیکن زہرا خود کو کسی کی جاگیر نہیں جانتی۔ یہ اس کی آزادی کا ایک بھرپور اعلان ہے۔ بہن کے اصرار میں اسے رسم رواج کی پابندی نظر آتی ہے۔ لیکن اس کا سوال یہ ہے کہ کیا کسی کو اس پر اپنی مرضی مسلط کرنے کا قانونی جواز میسر ہے؟ تعلقات کا دکھاوا اس بغاوت کو نہیں سہ پائے گا مگر زہرا نے اپنی زندگی خود گزارنے کا عزم کرلیا ہے۔

ناول کے خاتمہ تک زہرا کی بغاوت کی جگہ وہ اطمینان لے لیتا ہے، جو آزادی کی اصل دین ہے۔ شروع کی تلخی، خفگی اور مخاصمت اب اس کے اندر نہیں۔ اس نے سچ کو قبول کرلیا ہے اور اس کا سامنا کرسکتی ہے۔ اس نے اس سچ کو پالیا ہے، وہ اعتراف کرتی ہے، جو محنت سے، یقین سے اور بہت ہی معمولی چیزوں سے ملتا ہے۔ ایسی معمولی چیزیں جو ذکر کے قابل بھی نہیں۔ یہ زندگی کو قبول کرلینا ہے پسپائیت کے احساس کے نتیجہ میں نہیں بلکہ اپنی ذات کے اعتراف کے طور پر۔

یہ ناول نسائیت کے بارے میں مشکل سوال پوچھنے پر مجبور کرتا ہے۔ عورتوں کی

MashalBooks.org